بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اسلامی حکومت کو بعض لوگ Theocracy سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اصطلاح عیسائیوں کی ہے اور اس کے معنی ہیں بشپ کی حکومت علی الاطلاق۔ اسلام میں اس تصور کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آجکل کمیونزم وغیرہ ہیں۔ اس لئے اگر کوئی کمیونسٹ گورنمنٹ Theocratic نہیں ہو سکتی تو اسلامی حکومت کیونکر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ نظام جامد اور غیر متحرک نہیں ہے بلکہ ترقی پسندانہ ہے اور اس میں اس بات کی پوری صلاحیت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات کا حل اس طرح کر لے کہ سماج کے کسی ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے ساتھ، کسی ایک فرد کو کسی دوسرے فرد کے ساتھ جبر و ظلم کرنے کا موقع نہ ملے اور ہر طبقہ بلا اختلاف رنگ و نسل و مذہب اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے لئے معاشی اور سماجی فلاح و بہبود کا زیادہ سے زیادہ سر و سامان اور انتظام کر سکے۔ یہ نظام چونکہ ترقی پسندانہ ہے اس لئے وہ حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتا۔ اسی بنا پر ہم نے پہلے کہا ہے کہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو وہ سیکولر بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہمارے بعض دوست جنہیں سیکولر کا لفظ سننا بھی گوارا نہیں ہے اُن پر ہمارا یہ دعویٰ یقیناً گراں گذریگا۔ چنانچہ ایک معزز معاصر (دعوت دہلی) نے لکھ بھی دیا ہے کہ ہم پر مرعوبیت طاری ہے اور ایک خاص ماحول میں رہنے کے باعث ہم سیکولرزم کے گن گا رہے ہیں۔ لیکن اچھا! ہم پر اگر مرعوبیت طاری بھی ہے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر حمید اللہ، مسٹر محمد علی جناح اور ڈاکٹر اقبال کو کیا کہیئے گا جن کا ماحول ہمارے ماحول سے بالکل مختلف ہے اور جن پر کم از کم اس معاملہ میں مرعوبیت کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی حکومت کا تصور کس قدر رجعت پسندانہ ہے؟ یہ کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب اُن کے فکر کا تصادم حقائق سے ہوا تو انہیں بھی پاکستان کی تحقیقاتی کورٹ

جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس کے سامنے یہ اقرار کرنا پڑا کہ "اگر کبھی اس ملک (پاکستان) میں اسلامی حکومت قائم بھی ہوئی تو اس کی شکل صرف سکولر ہی ہوسکتی ہے (ملاحظہ فرمائیے رپورٹ ص ۲۰۱) ڈاکٹر حمید اللہ نے مدینہ کی پہلی اسٹیٹ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی اُس کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اُسے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے۔ یہی خیال انھوں نے اپنی مشہور بلند پایہ کتاب مجموعۃ الوثائق السیاسیہ میں جو عربی زبان میں ہے ظاہر کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔ فدخلوا فی دولۃ وفاقیۃ (Federation) تحت ریاسۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" (ص یل) علاوہ ازیں کئی سال ہوئے موصوف کا ایک مضمون "اسلامی اسٹیٹ" پر الاسلام کراچی میں شائع ہوا تھا اُس میں انھوں نے اس حکومت کے لئے "سیکولر" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور اُس کی غالباً وجہ یہی ہے کہ سکولرزم کے عناصر ترکیبی صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک مملکت کے ہر شخص کا شہری حقوق میں مساوی ہونا اور دوسرے تمام مذاہب کا آزاد ہونا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اسٹیٹ کے لئے جو دستور منظور فرمایا تھا اُس میں یہ دونوں چیزیں صراحت کے ساتھ مذکور تھیں چنانچہ اس کی دوسری دفعہ تھی "انہم امۃ واحدۃ من دون الناس" "پچیسویں دفعہ تھی" وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین للیہود دینہم وللمسلمین دینہم" پھر جیسا کہ بعد کی دفعات میں صاف طور پر مذکور ہے جو حقوق یہود بنی عوف کے لئے تسلیم کئے گئے تھے وہی یہود کے دوسرے قبائل اور اُن کے موالی اور حلفاء کے لئے بھی تسلیم کئے گئے تھے۔ معاشی مساوات کی تصریح دفعہ ۳۷ میں ہے جس میں فرمایا گیا وان علی الیہود نفقتہم وعلی المسلمین نفقتہم" (از ص ۱ تا ص ۵)

مسٹر محمد علی جناح پاکستان کے بانی اور موسس تھے اور اس ملک کا قیام اسلام اور قرآن کے نام سے ہی ہوا تھا، لیکن خود ان کے ذہن میں پاکستان کی حکومت کا کیا تصور تھا؟ وہ مرحوم کی اُس تقریر سے ظاہر ہے جو انھوں نے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ اس میں انھوں نے فرمایا تھا "اب اگر ہم پاکستان کی اس عظیم اسٹیٹ کو خوشحال اور مسرور بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں تمام لوگوں کی اور خاص طور پر عوام اور غریبوں کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہوجانا چاہئے۔ اگر تم لوگ (مسلم اور غیر مسلم) ماضی کی تلخیوں کو فراموش کرکے اور انہیں دفن کرکے باہم اشتراک و تعاون کے ساتھ کام کروگے تو تمہاری کامیابی

یقینی ہو. اگر تم اپنے ماضی کو بدل دو اور اس اسپرٹ کے ساتھ مل جل کر کام کرو کہ تم میں سے کسی شخص کا رنگ، مسلک اور مذہب خواہ کچھ بھی ہو بہرحال وہ اول و دوم اور آخر اس اسٹیٹ کا شہری ہو اور سب کے حقوق، مفادات اور فرائض و واجبات یکساں ہیں تو تمہاری ترقی کی کوئی حد نہیں ہوگی. میں اس حقیقت کو اس سے زیادہ اور پر زور طریقہ پر کس طرح بیان کر سکتا ہوں کہ ہمیں اس اسپرٹ کے ساتھ کام شروع کر دینا چاہیئے. وقت گذرنے کے ساتھ یہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ، ہندو اور مسلم کے تفرقے. پھر مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی سُنی اور شیعہ کے اور اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، ویش، کھتری اور بنگالی و مدراسی کے جھگڑے اور امتیازات خود بخود مٹ جائیں گے (غیر منقسم) ہندوستان میں اگر یہ جھگڑے نہ ہوتے تو ہندوستان اتنے عرصہ تک غلامی میں نہ رہ سکتا تھا اور اگر وہ رہا تو اس کی وجہ ان نزاعات کے علاوہ کوئی اور نہیں تھی. ہم کو ماضی سے سبق لینا چاہیئے" اس کے بعد موصوف نے انگلستان کی تاریخ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے باہمی جھگڑوں، آویزشوں اور اتحاد قومی پر اُن کے بُرے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا "تم آج دیکھتے ہو وہاں یہ سب جھگڑے کس طرح ختم ہو گئے. اب وہاں کا ہر شخص برطانیہ عظمیٰ کا شہری ہے جو مساوی حقوق رکھتا ہے اور وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں. میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں کو بھی اسی طرح ایک ہو کر کام کرنا چاہیئے. اگر ہم نے ایسا کیا تو پھر ہندو، ہندو نہیں رہے گا اور مسلمان، مسلمان نہیں، مذہبی طور پر نہیں کیونکہ اس کا تعلق تو ہر انسان کے ذاتی عقیدہ سے ہے بلکہ صرف ایک اسٹیٹ کے شہری ہونے کی سیاسی اصطلاح اور اس کے مفہوم میں" فاضل مقرر نے جو کچھ کہا ہے اس کا حاصل بجز اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا سو ہوا. اسے بھول جانا چاہیئے اور اب پاکستان کے ہر شخص کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ جہاں تک شہری حقوق کا تعلق ہے وہ سب کے لئے یکساں اور برابر ہیں اور ان میں ہندو، مسلمان، شیعہ سنی، برہمن اور غیر برہمن کی کوئی تفریق اور کوئی امتیاز نہیں ہے. پاکستانی نیشن ایک اکائی ہے اور یہ سب اُس کے افراد ہیں. ظاہر ہے مسٹر جناح مذہب کے عالم نہیں تھے اس بنا پر اُن کا کوئی قول یا ارشاد مذہبی حکم یا فتویٰ کی سند نہیں رکھتا. لیکن جہاں تک اس تقریر کی اسپرٹ اور اُس کے اصل مغز و معنی کا تعلق ہے ہماری رائے میں وہ اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور یہ اسلامی حکومت کے اُس ڈھانچہ سے متصادم نہیں ہے جو موجودہ بین الاقوامی اور

کی قومی حالات میں ہونا چاہیئے۔

اصل بات یہ ہے الجھن اس سے پیدا ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت یا "اسلامک اسٹیٹ" کا جب لفظ بولا جاتا ہے تو خواہ ہمارے علما ہوں یا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ دونوں کا ذہن ایک ایسی ریاست کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جس میں غیر مسلموں کے ساتھ ذمی کا معاملہ کیا جاتا ہو یا مستامن یا معاہد کا اور اس بنا پر اُن کو مسلمانوں کے ساتھ شہری حقوق میں برابری نہیں ہوتی۔ اسلامک اسٹیٹ کے اس تصور کا جب موجودہ بین الاقوامی حالات اور بین الاقوامی ضابطۂ اخلاق و قوانین کے ساتھ ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ تو سرے سے اس اسٹیٹ کے وجود کا ہی منکر ہوجاتا اور اس کو ناقابل عمل سمجھنے لگتا ہے۔ رہے علمار تو وہ جمودِ فکر اور تنگ نظری کے باعث اضطراب و انتشارِ ذہنی کا شکار ہوکر عجیب و غریب طرح کی مضحکہ انگیز باتیں کرنی شروع کردیتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ گذشتہ اشاعت میں گذر چکا ہے۔ اور مزید سنئے۔ اسی مذکورۂ بالا پاکستان کی تحقیقاتی کورٹ نے (جس کے صدر جسٹس محمد منیر تھے) جب علمار سے یہ سوال کیا کہ اچھا! یہ تو بتایئے کہ اسلامی اسٹیٹ کی تعریف کیا ہے؟ اور آپ کا اس کے متعلق تصور کیا ہے؟ تو بڑے بڑے علمار جن کی ہم دل سے عزت کرتے ہیں اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے۔ کسی نے کہا ایسی حکومت جیسی خلافتِ راشدہ کی تھی، کسی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا نام لیا اور کسی نے صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب عالمگیر کا۔ حد یہ ہے کہ جب یہی سوال سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری سے کیا گیا تو شاہ جی نے یہ کہہ کر بندر کی بلا طویلہ کے سر ڈال دی کہ "علما سے دریافت کیجئے" اس پر کمیشن نے ایک بلیغ فقرہ یہ لکھا ہے "اور آپ امیرِ شریعت یونہی بن گئے" اسی طرح کورٹ نے پوچھا کہ اسلامی اسٹیٹ میں غیر مسلموں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب بھی کوئی قطعی اور تشفی بخش نہیں دیا جاسکا۔ کسی نے کہا "ذمیوں کا سا" کوئی بولا "مستامین کا سا" جب دماغ میں کسی ایک مسئلہ کے متعلق الجھن اور پیچیدگی ہوتی ہے تو اس سلسلہ کی بعض بدیہی جزئیات بھی فنطری ہوجاتی ہیں اور آدمی اُن کے متعلق کسی سوال کا جواب بھی صاف دماغی کے ساتھ نہیں دے سکتا چنانچہ "اسلامک اسٹیٹ" پر سوال کے ضمن میں ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے" جسے آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کبھی پوچھا گیا "اسلام

کیا ہے" ؟ تو آپ نے ہمیشہ دو لفظوں میں جواب ارشاد فرما کر سائل کو مطمئن کر دیا۔ لیکن یہاں عالم یہ ہے کہ علمائے اعلام جمع ہیں، زعمائے ملت موجود ہیں اور پھر کوئی ڈھنگ کا بالکل قطعی اور محکم جواب نہیں دیتا اور اس سادہ سے سوال کا جواب "جتنے منہ اتنی باتیں" کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ چند نامور علماء نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ہم اس قدر کم وقت میں اس سوال کا جواب کیونکر دے سکتے ہیں اس کے لئے تو کم از کم ایک ہفتہ کا اور بعض نے کہا دو دن کا وقت ملنا چاہیئے" یہ پریشان دماغی نتیجہ ہے صرف اس چیز کا کہ اسلامک اسٹیٹ کے متعلق ان حضرات کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ان کا جو تصور ہے وہ اس قدر رجعت پسندانہ ہے کہ جب حقائق سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو یہ لوگ انتشار ذہنی کا شکار بن کر رہ جاتے ہیں۔

ان حضرات نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ذمی۔ حربی۔ مستامن اور معاہد۔ یہ سب اصطلاحیں اس زمانہ کے لئے تھیں جبکہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کسی ملک کو عَنوۃً (بزور شمشیر) یا صلحاً فتح کرتے تھے۔ مگر آج یہ دونوں صورتیں مفقود ہو گئی ہیں۔ خود غیر منقسم ہندوستان کی مثال لیجئے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہندو مسلمان دونوں اس ملک میں صدیوں سے ساتھ رہتے بستے چلے آئے تھے۔ یہاں کے گرم و سرد۔ خشک و تر۔ شادی و غم اور آزادی و غلامی میں دونوں ایک دوسرے کے برابر سہیم و شریک تھے۔ ملک کو آزاد کرانے کے لئے دونوں نے جدوجہد کی اور اس راہ کی آزمائشوں اور تکلیفوں میں دونوں ایک ساتھ رہے اور حقیقت یہ ہے کہ ملک کسی ایک خاص فرقہ کی تنہا کوششوں سے آزاد ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر ملک جب آزاد ہوا تو تقسیم بھی ہوا۔ یہ تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کے آپس کے سمجھوتہ سے ہوئی۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں مسلمان ادھر اور ہندو ادھر بطور اقلیت رہ جائیں گے۔ ان کے متعلق دونوں جماعتوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے اپنے ملک کے ایسے ہی شہری ہوں گے جیسا کہ اکثریت کے لوگ ہیں۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو کانگریس اور لیگ کے نمائندوں نے دلی کے ریڈیو اسٹیشن سے جو تقریریں براڈکاسٹ کی تھیں ان میں اقلیتوں کے متعلق یہ یقین دہانی صاف لفظوں میں کر دی گئی تھی۔ ایک طرف اس چیز کو سامنے رکھئے اور دوسری جانب ان پہلوؤں پر غور کیجئے کہ

(۱) ہندوستان اور پاکستان دونوں برطانوی کامن ویلتھ کے ممبر ہیں۔

(۲) دونوں مجلس اقوام متحدہ (U.N.O.) کی جنرل اسمبلی کے ممبر ہیں۔
(۳) دونوں ایک دوسرے کے قریبی ہمسایہ ہیں اور بیسیوں معاملات میں اُن میں آپس میں معاہدے ہیں
(۴) ہندوستان نے ملک کی حکومت کو سکولر قرار دیکر یہاں کے مسلمانوں کو دستوری طور پر مکمل شہری حقوق دیدیئے ہیں اور اس کے عملی شواہد بھی ہیں۔

یہ تو وہ حالات ہیں جو مقامی اور صرف ان دو ملکوں کے درمیان دائر و سائر ہیں، ان کے علاوہ بین الاقوامی طور پر سوچئے تو معلوم ہوگا کہ آج کی سیاست میں یہ بالکل ناممکن ہو کہ ایک ملک کے مختلف المذاہب باشندوں کے درمیان مذہب یا رنگ ونسل کی بنیاد پر شہری حقوق کے بارہ میں کوئی خطِ فصل کھینچا جائے ورنہ یہ ملک سیاسی اعتبار سے کبھی مستحکم اور مضبوط نہیں ہو سکتا۔ مجلس اقوام متحدہ میں اُسے کوئی پوزیشن نہیں مل سکتی اور جنوبی افریقہ کی طرح دنیا کے ہر انسان کی نظر میں کھٹکتا ہی رہے گا۔
اب ان سب حقائق کو سامنے رکھ کر بتایئے۔ اسلام کی تعلیمات کی رو سے پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہونی چاہیئے؟ ہر وہ شخص جس کی نظر اسلام کے متنوع احکام و مسائل اور اُن کے علل و وجوہ پر ہے اور جو اس حقیقت سے باخبر ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں (جن میں منافق اور مولفۃ القلوب بھی شامل ہیں) کے ساتھ کس درجہ رواداری۔ ترغیب و تدریج اور تبشیر و تالیف کا معاملہ کیا ہے اور اس معاملہ میں حالات و مواقع کا کتنا گہرا احساس اور تنوع پایا جاتا ہے اس سوال کے جواب میں یہ کہنے میں ہرگز کوئی تامل نہیں ہوگا کہ حکومت کو سیکولر ہونا چاہیئے جس کے ماتحت ہندو اور مسلمان سب یکساں شہری حقوق کے مالک ہوں۔ یہ سیکولرزم اسلام کی ضد نہیں بلکہ جیسا کہ آپ نے ابھی دیکھا عین اسلام کی تعلیم ہے۔ اس بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ مسٹر محمد علی جناح نے مذکورہ بالا تقریر میں پاکستان گورنمنٹ کی آئندہ شکل وصورت کے بارہ میں جو کچھ فرمایا بالکل بجا فرمایا اور اسلام کی عین تعلیمات کے مطابق فرمایا۔
ہم میں سے بہت سے لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ جہاں کوئی معاملہ (خواہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کیسا ہی جدید ہو) اُن کے سامنے آیا اور وہ جھٹ حضرت عمرؓ کی مثال لے دوڑے کہ آپ نے یہ کیا اور ایسا کیا، حالانکہ آج اگر فاروق اعظمؓ ہوتے تو اُن کی ایک جنبشِ نگاہ امریکہ اور روس دونوں

کو چونکا دینے کے لئے کافی ہوتی اور اُن کا دارالخلافہ تہذیب و تمدن صنعت و حرفت علوم جدید کی تعلیم و تعلم، وسعت و نزہت صفائی اور شائستگی کے باعث غیرت ماسکو و واشنگٹن ہوتا۔ اس لئے جہاں تک معاملات و مسائل کا تعلق ہے اُن کے بارہ میں حضرت عمرؓ کے انداز فکر، طریق کار اور اصول اجتہاد و استنباط کو سامنے رکھ کر سوچنے اور غور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آج اگر وہ موجود ہوتے تو کیا کرتے؟ اس کے لئے ضرورت اجتہاد کی ہے مگر یہ کون کرے؟ اس سلسلہ میں اُن حضرات سے کیا توقع ہو سکتی ہے جنہیں حیات النبی۔ تراویح کی رکعات۔ میلاد میں قیام اور آپس میں ایک دوسرے کو تکفیر و تفسیق سے ہی فرصت نہیں ہو فیا لغربۃ الاسلام و وحشتہ۔

مسٹر جناح نے جو بات کہی تھی بڑے پتہ کی اور سو فیصدی درست کہی تھی اگر اسے صدق دلی سے اپنا لیا جاتا اور جذبہ یہ نہ ہوتا کہ ہندوستان کے مسلمان چاہے شودر اور ملیچھ بن کر رہیں۔ بہرحال پاکستان میں ان کے اپنے مخصوص تخیل کے ماتحت اسلامی حکومت ہو جس کے ماتحت وہاں کے غیر مسلمین کو مساوی شہری حقوق حاصل نہ ہوں تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ نہ پاکستان میں وہ قیامت برپا ہوتی جو ۵۰ء اور ۵۲ء میں ہوئی اور نہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن حالات سے سابقہ پڑتا جو آئے دن انہیں پیش آتے رہتے ہیں۔ قوموں اور فرقوں کے باہمی تعلقات میں چند وقتی نفسیاتی احساسات و تاثرات ہی تو ہوتے ہیں جو فوری طور پر ان تعلقات کو بگاڑ دیتے یا سنوار دیتے ہیں اور ایک قوم کے لیڈر کا فرض ہے کہ ان نفسیاتی عوامل و موثرات سے کبھی چشم پوشی کا معاملہ نہ کرے۔ آج مجموعی طور پر یہاں کے ہندوؤں کے دل میں یہ بات جم گئی ہے کہ یہ مسلمان خوب رہے، یہاں سیکولرزم کے ماتحت ہمارے ساتھ ہر چیز میں برابر کے شریک اور وہاں خالص ان کی حکومت! یہ واقعہ ہے کہ ملک کی تقسیم دونوں قوموں کے باہمی بغض و عناد اور نا اتفاقی و شکر رنجی کے ماتحت ہوئی تھی اور اس کے بعد صورت حال یہ پیش آئی جس کا ذکر ہوا۔ پھر حالات سدھریں اور درست ہوں تو کیونکر؟ اور تو اور پنڈت جواہر لال نہرو کے دل سے اب تک یہ کانٹا نہیں نکلا اور جب کبھی انہیں موقع ملتا ہے پاکستان پر تھیاکریسی (Theocracy) کا فقرہ چست کر گذرتے ہیں۔ مسٹر جناح نہایت ذہین اور دوراندیش انسان تھے۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اسی کے

سدباب کے لئے کہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیتے۔ لیکن مرحوم نے جو کچھ کہا تھا اسے اس اغراضی تجویز (Objective Resolution) کے ذریعہ ختم کر دیا گیا جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا تھا اور جس میں پاکستانی گورنمنٹ کے اسلامی ہونے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن کیا اس ریزولیوشن کے منظور ہوتے ہی پاکستان واقعی اسلامی ریاست بن گیا ؟ اس کا جواب جسٹس محمد منیر کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس بات کا ہر شخص کو کھلے لفظوں میں اعتراف ہے کہ یہ ریزولیوشن اگرچہ بڑا بھڑکیلا، زوردار اور طمطراق رکھنے والا ہے اور اس کے "چھلے" الفاظ اور عبارت سب میں بڑا جوش و خروش دکھایا گیا ہے لیکن یہ محض ایک دھوکا اور فریب ہے اور اسلامی ریاست کی تو اس میں بو بھی نہیں ہے، علی الخصوص بنیادی حقوق کے متعلق اس میں جو دفعہ ہے وہ براہ راست اسلامی ریاست کے اصول کے خلاف ہے۔" (رپورٹ ص ۲۰۳)

اب ذرا سوچئے! اس انزا تفری کا حاصل کیا ہوا ؟ یہی نا کہ پاکستان گورنمنٹ مسٹر جناح کے تخیل کے ماتحت سکولر بھی نہیں ہو سکی اور اسلامی بھی نہ بن سکی۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

اب ڈاکٹر اقبال کو لیجئے! مرحوم کی نسبت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت کا تخیل سب سے پہلے انھوں نے پیش کیا! لیکن ان کے تخیل میں بھی اس حکومت کی شکل کیا تھی ؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر اجلاس کی حیثیت سے انھوں نے جو خطبہ پڑھا اور جس میں سب سے پہلے اپنے اس تخیل کا انھوں نے اظہار کیا تھا اس میں فرمایا:۔

ہندوؤں کو اس بات کا خوف نہیں کرنا چاہئے کہ ایک خود مختار مسلم اسٹیٹ کے قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس ریاست میں کوئی مذہبی قسم کی حکومت ہوگی، یا اصول کہ ہر گروپ کو اپنی صواب دید کے مطابق ترقی کرنے کا موقع ملنا چاہئے اور وہ اس کا حقدار ہے کسی

تنگ نظر فرقہ پرستی کا نتیجہ و آفریدہ نہیں ہے"

غور کیجئے! اس میں ڈاکٹر صاحب نے جس اصول کو بنیاد مان کر ایک مسلم اسٹیٹ کا مطالبہ کیا ہے۔ کیا اُس کی حقیقت سکولرزم سے بڑھکر کچھ اور بھی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اور ریاست میں بہت بڑا فرق ہے۔ خلیفہ بجز مسلمان کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا لیکن خلافت تو خلافت راشدہ کے بعد ہی ختم ہو گئی اور اب اس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں ہے، رہی ریاست تو وہ ملی جلی اور مخلوط بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک جمہوریہ میں قانون سازی کی اصل طاقت پارلیمنٹ یا نیشنل اسمبلی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو عوام کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ پس اگر پارلیمنٹ میں اکثریت مسلمانوں کی ہے تو وزیر اعظم چھوڑ صدر جمہوریہ اگر غیر مسلم بھی ہے تو وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتا، اور اس کے برعکس اگر صدر جمہوریہ مصطفےٰ کمال پاشا قسم کا کوئی مسلمان ہے تو وہ اسلام کے لئے ممد و معاون ہونے کے بجائے اور اس کا بیڑہ ہی غرق کر دیگا۔ اس بنا پر اصل جو کچھ بھی ہے مسلمانوں کا ایمان و عمل، کردار اور اخلاق کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات و افکار کا پیکر ہونا ہے۔ محض کسی بڑے عہدہ دار کا مسلمان ہونا نہ ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس طرح کی لفظی اور رسمی بندشیں اور تحفظات وہی قوم کرتی ہے جس کی خودی بیدار نہیں ہوتی جس کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوتا۔ اور جو احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے باعث اپنے سایہ سے بھی گریزاں ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو جسٹس محمد منیر نے بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ذیل میں ہم اُس کا اقتباس نقل کرتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کو عام آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلامی اسٹیٹ ہے۔ اگرچہ درحقیقت وہ ایسی نہیں ہے اس خیال کو تقویت اس بات سے پہونچی ہے کہ مسلمان گذشتہ ایام میں ہر طرف سے اسلام اور اسلامی اسٹیٹ کے لئے شور و غل مچاتے رہے ہیں۔ اسلامی اسٹیٹ کا تخیل مسلمانوں کے دماغ میں ایک مدت سے بسا چلا آرہا ہے اور یہ نتیجہ ہے اُس شاندار ماضی کی یاد کا جبکہ اسلام دنیا کے ایک گمنام گوشہ (صحرائے عرب) سے طوفان کی مانند اٹھا اور دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طوفان نے اُن مصنوعی خداؤں کو اُن کے مسند اقتدار سے کھینچکر باہر پھینک دیا۔

جو اتبک انسانوں پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے اُس نے صدیوں کے پُرانے اداروں اور تہذیبوں کو جن کی بنیاد انسانوں کی غلامی پر رکھی گئی تھی جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر رکھدیا ایک سو پچیس برس کی مدت اور وہ بھی ایک قوم کی تاریخ میں ہوتی ہی کتنی ہے. مگر اس مختصر مدت میں ہی اسلام دریائے سندھ سے اٹلانٹک اور اسپین تک اور ادھر حدود چین سے لے کر مصر تک پھیل گیا اور عرب کے صحرانشینوں نے تہذیب و تمدن کے دیرینہ مرکزوں یعنی عراق، دمشق، اسکندریہ، ہندوستان اور وہ تمام جگہیں جو سمیری اور اسیرین تہذیب و تمدن سے وابستہ رہی تھیں اُن میں اپنا پرچم لہرادیا. مورخین نے اکثر یہ سوال کیا ہے کہ دنیا کا آج نقشہ کیا ہوتا اگر معاویہ کا محاصرۂ قسطنطنیہ کامیاب ہوگیا ہوتا. یا جبکہ عبدالرحمٰن کے مجاہد جنوبی فرانس میں چارلس مارٹل کے خلاف جنگ کرتے کرتے اچانک لوٹ مار میں مشغول نہ ہوجاتے، اگر ایسا ہوتا تو بہت ممکن ہے مسلمان کولمبس سے بہت پہلے امریکہ کا پتہ لگا لیتے اور پوری دنیا مسلمان ہوگئی ہوتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام خود یورپ کے زیر اثر آجاتا (جیسا کہ ایران میں ہوا) صحرانشینانِ عرب کے یہ وہ شاندار کارنامے ہیں جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں نظر آتی. آج کا مسلمان اُس شاندار ماضی کو یاد کرکر کے اسے واپس لانے کی آرزو کرتا ہے. مگر وہ عجیب کشمکش و پیچ کی حالت میں کھڑا ہے، اُس کے چہرہ پر گذشتہ ماضی کی یاد کی نقاب پڑی ہوئی ہے مگر اس کی پیٹھ صدیوں کی ناکامی و نامرادی اور شکست کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے. اس عالم میں وہ نہیں جانتا کہ کدھر قدم بڑھائے اور کہاں کا رُخ کرے. عقیدہ کی سادگی اور پختگی جس نے اسے پہلے عزم و قوت کی دولت بخشی تھی اب وہ اس سے محروم ہے. اب نہ اُس میں فتح کرنے کی طاقت ہے اور نہ اُس کی اہلیت اور اب کچھ ہے بھی نہیں جسے وہ فتح کرلے. وہ قطعًا اس بات کو نہیں سمجھتا کہ آج جو طاقتیں اس کے خلاف صف آرا ہیں وہ اُن طاقتوں سے بالکل مختلف ہیں جن کے خلاف گذشتہ زمانہ میں اسلام کو نبرد آزما ہونا پڑا تھا اور خود اس مسلمان کے

آبا و اجداد کے بتائے ہوئے نشانِ راہ پر چلکر آج انسانی ذہن نے وہ چیزیں معلوم کرلی ہیں جنھیں یہ مسلمان خود نہیں سمجھ سکتا۔ اس بنا پر مسلمان آج عالم حیرانی و پریشانی میں کھڑا کسی ایسے شخص کی راہ تک رہا ہے جو یک بیک نمودار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے اس کی منزل تک پہنچا دے۔ اب (یاد رکھنا چاہئے) اسلام کو ایک عالمی نصب العین (idea) کی حیثیت سے محفوظ رکھنے اور مسلمانوں کو حال اور مستقبل کی دنیا کے شہری بنا دینے کی راہ بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ اسلام کی تجدید بجراُت کے ساتھ کی جائے تاکہ ضروری اور زندہ جاوید حصّہ کو غیر ضروری اور بے جان چیزوں سے الگ کرلیا جائے، صاف دماغی اور جراُت کے ساتھ غور کرنے کی بھی کمی اور معاملات کو سمجھنے اور اُن کی نسبت فیصلہ کرنے کی بھی وہ نااہلیت ہے جس نے پاکستان میں یہ ٹریجڈی پیدا کی اور اگر ہمارے لیڈروں نے اب بھی مقصد کو متعین کرنے کے ساتھ اس کے حصول کے ذرائع کو صاف ذہن کے ساتھ معین نہیں کیا تو یہ صورت حال بار بار پیدا ہوتی رہے گی۔ اسلام بحیثیت ایک اعلیٰ مذہب اور عقیدہ کے بہرحال زندہ رہے گا۔ یہ عقیدہ فرد میں اس کی روح اور اس کی نظر میں رہتا ہے۔ اُن تمام تعلقات میں رہتا ہے جو ایک انسان کے خدا کے ساتھ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور پیدائش سے لے کر مرنے تک ساتھ رہتا ہے اور ہمارے سیاست دانوں کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر خدا کے احکام کسی شخص کو مسلمان نہیں بنا سکتے یا اُسے مسلمان نہیں رکھ سکتے تو ان کے بنائے ہوئے قوانین ہرگز ہرگز اس راہ میں کارگر نہیں ہو سکتے۔" (صفحہ ۳۳۱-۳۳۲)